نذر سجاد حیدر کے ناول اخترالنسا بیگم میں سماجی مسائل کی عکاسی

غزل یعقوب

ABSTRACT:

Nazar Sajjad Haider was verstyle writer ,she had many dimentions of her writtings like essay writer,auto biographer and a novelist. As novelist her work is remarkable.She presented women's problems is the social perspective of colonial India.She raised her voice against Parda,poligamy and social pressures against womens education .These all issues were adressed in her novels in a very relist and creative way.In the proposed study an effort has been made to explore social behaviours which were depicted in Nazzar Sajjad haider 's Novels.e.g Child marriage, dowery, social reactions on birth of girls.etc

نذر سجاد حیدر اردو کی اہم ناول نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔انھوں نے اپنے ناولوں میں اس دور کے ہندوستانی معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کی اور ان تصاویر میں یوں رنگ بھرے ہیں کہ تمام تر احوال اپنے حقیقت سمیت قاری کے ذہن پر نقش چھوڑ دیتے ہیں۔ نذر سجاد سماجی اور اصلاحی کاموں کی سر گرم رکن تھیں اس لیے اس کی پیشکش ان کی تحریروں میں واضح نظر آتی ہے۔نذر سجاد حیدر نے اپنے ناولوں میں معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس میں موجود مسائل سے پردہ اٹھایا ہے اور پھر ان مسائل کے سد باب کی کوشش کی ہے اور ساتھ ساتھ ان سماجی مسائل کامناسب حل بھی تجویز کیا ہے۔ان کی تحریروں میں اخترالنسابیگم، جان باز، حرماں نصیب، آہ مظلوماں، نجمہ، اورثریاشامل ہیں۔

زیرنظر تحقیق نذر سجاد حیدر کے ناولاخترالنسا بیگمپر کی گئی ہے جو ۱۹۱۰ء میں دارالاشاعت پنجاب، لاہورسے شائع ہوا۔ ناول کا عنوان اخترالنسا بیگم ہے اور ناول کا مرکزی کردار بھی اختر النسا ہی ہے۔ اس حوالے سے اسے کرداری ناول کہنا بے جا نہ ہوگا۔ناول میں تئیس ابواب پر مشتمل اختر کی داستانِ زندگی رقم کی گئی ہیجو اس دور کے مسائل سے متاثر تھی۔سماجی مسائل کی ایک وجہ تعلیم نسواں کا نہ ہونا ہے۔ناول میں ہندوستان کے اعلیٰ متوسط طبقے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جس میں تعلیم یافتہ اور ان پڑھ دونوں طرح کے کردار پیش کیے گئے اور یہ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پڑھا لکھا انسان ہی زمانے کا بہتر اور پر وقار فرد بن سکتا ہے اور معاشرے میں مثبت تبدیلی لا سکتا ہے۔جبکہ ان پڑھ انسان معاشرے پر از خود ایک بوجھ کی حیثیت رکھتا ہے اورمنفی کردار معاشرے میں تخریبی رویوں کو ہوا دیتے ہیں۔غرض یہ کہ ناول میں نذر سجاد حیدر نے تعلیم یافتہ اور ان پڑھ اشخاص کے موازنے سے نظریہ تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔تعلیم کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی معاشریمیں پائے جانے والے فرسودہ رسوم ورواج اور ان کے نتیجے میں ہونے والے مسائل

اور معاملات کو بھی ناول میں پیش کیا گیا ہے۔مصنف نے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان پڑھ خواتین شعور نہ ہونے کی وجہ سے دیرینہ رسومات میں الجھی ہوئی ہیں اور اپنے وقت اور روپے کے زیاں سے بے خبر معاشرے میں اونچی ناک کے چکر میں الجھ کر رہ گئیں ہیں حالاں کہ وہ اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ معاشرے میں قدرو منزلت روپے پیسے سے نہیں بلکہ اچھی اقدار سے ہوتی ہے۔یہاں مادی فکر کا تجزیہ ایک قابل ذہن سے کرتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک پڑھی لکھی عورت اپنی عقل و فہم کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے قیمتی وقت اور روپے کو برباد ہونے سے بچا لیتی ہے اور دوسروں کے لیے بھی باعث تکلیف نہیں بنتی۔رسومات کا ذکر کرتے ہوئے شادی کے معاملات اور اس سے متعلقہ رسومات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے، جس میں خواندہ اور ناخواندہ دونوں طبقات کے کردار پیش کیے گئے ہیں۔رسومات کی ذیل میں صغر سنی کی منگنی، لڑکی اور لڑکے کا شادی کے بارے میں رائے کا اظہار اور پسندیدگی، بچے کی پیدائش پر کی جانے والی بے جا رسومات، بیوہ کو پیش آنے والے مسائل خصوصاً مسئلہ معاش وغیرہ کوپیش کیا گیا ہے۔اسی دوران معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک اور اس کیمسائل کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے اور یہ باور کروانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح معاشرہ عورت کے راستے کی رکاوٹ بن کر اسے رسوم و رواج کے چکر میں الجھائے رکھتا ہے۔ایسے میں اسے اپنے وقار کو برقرار رکھنے اور اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے کے لیے لباس، نام اور بعض اوقات طرز رہن سہن تک کو تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ناول میں اس وقت کے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی بہترین انداز میں کی گئی ہے جس سے نہ صرف معاشرتی اقدار کے بارے میں معلومات ملتی ہیں بل کہ انسانی رویے اور ان کے فرد پر اثرات بھی بخوبی سمجھے جا سکتے ہیں۔ناول میں خواتین کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے اور ایک سوتیلی ماں کے دباؤ میں دبی ہوئی بن ماں کی بچی کے حالات و واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔

اصلاح معاشرہ:

نذر سجاد حیدر نے جس دور میں اپنی ادبی خدمات کا آغاز کیا اس دورمیں انسانیت بری طرح مجرو ح ہورہی تھی اور محض مرد عورت کا استحصال نہیں کر رہا تھا بل کہ انسان کے ہاتھوں انسانیت کا استحصال جاری تھا۔طاقت ور کم زور پر، حاکم محکوم پر بری طرح سے تسلط پا چکا تھا۔اس سے معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو گیا تھا او ربے پنا ہ مسائل کا گھر بن گیا تھا۔اس کی ایک اہم وجہ تعلیم اور شعور و آگہی کافقدان تھا۔اخترالنسا بیگم میں نذر سجاد حیدر نے معاشرتی مسائل کی بھر پور عکاسی کی ہے اور ان معاشرے میں ان مسائل کے خاتمے کے لیے عملی کوشش اس ناول کی صورت میں ملتی ہے۔

۱۔ صغر سنی کی منگنی کی مخالفت

ہندوستانی معاشرے میں شادی کے معاملات میں لڑکے اورلڑکے کے اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے، پسند نا پسند تو دور کی بات ہے لڑکے اور لڑکی کی منگنی حتیٰ کہ نکاح بھی عمر کے اس حصے میں کر دیا جاتا تھا جب اسے زمانیسے واقفیت تو درکنار خود اپنی سدھ بدھ نہیں ہوا کرتی تھی

اور وہ کھرے کھوٹے کی پہچان سے عاری ہوا کرتا تھا۔ناول میں جہاں دیگر سماجی مسائل پیش کیے گئے ہیں وہانصغر سنی میں منگنی کے مسئلے کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح بچپن میں کی جانے والی منگنیاں بعد ازاں ذہنی ہم آہنگی نہ ہو نے کی بنا پر عدم مطابقت کا باعث بنتی ہیں اور دوافراد کے ساتھ ساتھ خاندانوں کیدرمیان مسائل کا باعث بنتی ہیں۔

۲۔ شادی کے معاملات میں لڑکی اور لڑکے کی پسند

شادی پوری عمر کا ساتھ ہے اور اس ساتھ میں لڑکا اور لڑکی ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کا سفر طے کرنا محال ہو جاتا ہے۔اسی لیے ضروری ہے کہ شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی دونوں کی پسندیدگی کا پوچھ لیا جائے تا کہ ان کے لیے یہ سفر خوشگوار ہو سکے اور وہ معاشرے کے بہتر فرد ہونے کے ناطے اپنے فرائض بطریق احسن سر انجام دے سکیں اور آنے والی نسلوں کی بھی بہتر تربیت کر سکیں۔اسی موضوع کو احاطہ تحریر میں لاتے ہوئے نذر سجاد حیدر نے اپنے ناول میں شادی کے معاملات میں لڑکی اور لڑکے کی پسند کے مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ہندوستانی معاشرے میں شادی کے معاملات میں لڑکی سے رائے لینا تو درکنار لڑکے کے اظہار کو بھی معیوب سمجھا جاتا تھا اور والدین کی مرضی سے تمام تر رشتے طے پاتے تھے۔جو بعدمیں اکثر ناچاقی و بے سکونی کا باعث بنتے تھے۔ ناول میں ہندوستانی معاشرے کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

..."مس صاحبہ کو اس سے بہت ہمدردی تھی۔اختر کی شادی ان کو بالکل نا پسند تھی۔اور بہت سمجھاتی تھیں کہ "تم انکار کر دو "مگر اختر ہندستانی شرم کی پتلی تھی۔وہ ان کی اس قسم کی باتیں سن بھی نہ سکتی تھی۔اور کہہ دیتی تھی کہ"آپ اس باب میں کچھ نہ کہیں۔جو میرے والدین کو منظور ہے۔وہ ہو گا"(۱(

درج بالا سطور میں جیسے کہا گیا ہے کہ اس دور میں لڑکیوں کے ساتھ ساتھ لڑکوں کو بھی شادی کے معاملے میں آزادی رائے کا حق حاصل نہ تھا۔جرات اظہار کی کمی کی وجہ سیوہ اپنی زندگیاں اپنے والدین کے رحم و کرم پر جینے کے لیے مجبور تھے۔اس کی عکاسی ناول میں کی گئی ہے:

..."سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ ان لڑکوں کی اس جگہ اپنی مرضی بھی ہے یا نہیں؟کہیں ایسا ہی نہ ہوکہ"ماں باپ کا کیا سر پر دھرا"کے لحاظ سے لڑکے خاموش ہوں"(۲(

جس پدرسری معاشرے میں اختر جی رہی تھی وہاں کے معزز افراد جہاں معاشرتی رویوں کو بہتر بنانے اور استحصال کی جڑوں کو کمزرور بنانے کے لیے دن رات کوشاں تھے وہاں ایک پڑھی لکھی اور با شعور لڑکی ہی معاشرتی جبر کا شکار ہو گئی اور اپنی زندگی انجان راستوں پر گزارنے کے لیے مجبور کر دی گئی اس کی مثال ذیل کی سطور میں ملتی ہے:

"افسوس مجھے اتنا بھی معلوم نہیں۔کہ میں آج جن لوگوں کے سپرد کی گئی ہوں۔وہ لوگ کون ہیں۔کہاں کے ہیں؟کیسے ہیں؟جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہو گی۔اس کی عادات۔مزاج، اخلاق۔تعلیم۔عمر۔خیالات۔نام تک بھی تو مجھے نہیں معلوم..."(۳(

۳۔ شادی پر کی جانے والی فضول رسومات

اخترالنسا بیگم میں نذر سجاد حیدر نے جہاں معاشرے کی اصلاح کاکام کیا وہاں اس میں مروجہ فضول رسوم و رواج کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کے نقصانات واضح کیے۔جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس ناول میں نذر سجاد حیدر نے دو طبقات کا تقابل کرتے ہوئے مسائل کی عکاسی اور ان کا حل پیش کیا ہے جس میں برتری پڑھے لکھے طبقے کو دی گئی ہے، اسی حوالے سے پڑھے لکھے طبقے کے نمائندہ مسٹر وقار کی شادی کی رسومات کے حوالے سے کی کئی بحث کو وہ یوں پیش کرتی ہیں:

"میں اس شادی میں فضول رسومات مروجہ اٹھا دینی چاہتا ہوناور یہی شادی ہماری برادری کے لیے نظیر قائم ہو گی۔اسی طرح جہیز میں بھی کمی کی جائے۔سینکڑوں جوڑے کپڑے اور دیگر فضول چیزیں بالکل نہ ہوں گی"(۴(

اسی طرح اس زمانے میں بارات کے معاملے میں اگر دولہے کے ساتھ زیادہ براتی ہوتے تھے تو دلہن والے برا مان جاتے تھے لیکن مسز وقار نے اس کی مزمت کرتے ہوئے کہا کہ:

"مسز وقار:میں نے لکھ دیا ہے کہ اس خیال سے بہت سے آدمی ساتھ لانے کی فکر میں مت پڑنا کہ بھاری برات سے ہم خوش ہوں گے۔ہمیں ایسی فضول شیخی پسند نہیں ہے۔صرف اپنے رشتہ داروں اور چند عزیز دوستوں کو ساتھل لے آؤ تو کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔

...میری تو رائے ہے کہ پہلے مہمانوں کو بالکل جمع نہ کیا جائے۔یہی تو فضولیات ہیں۔جن سے بہت سا روپیہ برباد ہو جاتا ہے..."(۵(

علاوہ ازیں ناول میں نذر سجاد حیدر نے جن رسومات کا ذکر کیا ہے ان میں شادی سے کئی ہفتے قبل تمام تر رشتے دار اور اقربا کا ہجوم اورشور و غل جس سے وقت کے ساتھ ساتھ پیسے کا زیاں بہت زیادہ ہوتا ہے۔

شادی سے مہینہ قبل گھر کی صفائی کے رواج جس میں سفیسی، قلعی، فرش بچھانا وغیرہم جیسے معاملات پر بحث کی گئی ہے اور یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان سب مسائل کا حل محض تعلیم نسواں میں پوشیدہ ہے اگر مستورات کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر دیا جائے تو وہ ان مسائل میں الجھنے سے بچ جائیں گی۔

۴۔ نتھ کا رواج

ہندوستان میں جہاں قدیم فرسودہ روسوم رش بس گئی تھیں وہاں نتھ کا رواج بھی عام تھا اور اسے عزت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔خواتین کے ناک میں خاص طور پر چھید کروا کر اسے نتھ پہنا دی جاتی تھی جو مرد کی عزت اور بالا دستی کو ظاہر کرتی تھی اور بعض لوگ اسے عورت کی محکومی سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور شادی کے وقت خاص طور پر عورت کے ناک میں نتھ پہنائی جاتی تھی تا کہ عمر بھر شوہر کی غلام و تا بعدار رہے۔ اس حوالے سے نذر سجاد حیدر نے اپنے نظریے کی پیشکش یوں کی ہے:

"مسز وقار: نتھ کے لیے جو انھوں نے پوچھا تھاکہ کیا کروں؟چند احباب کہتے ہیں کہ تمھیں تیار کرانی ہو گی۔میں نے لکھ دیا ہے کہ اس واہیات نشان بے عزتی و کنیز کی کی ہمیں بالکل ضرورت نہیں۔ہمارے یہاں ناک میں سوراخ کرانے کا بالکل دستور نہیں"(۶(

۵۔ جہیز

لڑکی کی شادی کے موقع پر والدین اپنی بیٹی کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے جہیز کے طور پر کچھ تحائف دیتے ہیں تا کہ نئے گھر میں جا کر اسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اس کی ضروریات پوری ہو تی رہیں، اسلام میں وراثت میں لڑکی کا باقاعدہ حق رکھا گیا ہے اس کے علاوہ والدین پر کسی قسم کی زبردستی عائد نہیں ہے کہ وہ بیٹی کو بھاری جہیز دیں ہاں مگر لڑکی بہترتعلیم و تربیت کو والدین کا فرض قرار دیا گیا ہے۔جہیز کے حوالے سے خالد سیف اللہ رحمانی اپنی کتاب میں جہیز و تلک کی رسم کے متعلق رقم طراز ہیں:

اسلام میں نکاح کی حیثیت ایک معاہدہ کی ہے جس میں مرد و عورت قریب قریب مساویانہ حیثیت کے مالک ہیں یعنی نکاح کی وجہ سے شوہر بیوی کا یا بیوی شوہر کی مالک نہیں ہوتی اور عورت اپنے خاندان سے مربوط رہتی ہے۔ والدین کے متروکہ میں تو اسکو لازمًا حصہ میراث ملتا ہے۔ بعض اوقات وہ بھائی بہنوں سے بھی حصہ پاتی ہے۔ ہندو مذہب میں نکاح کے بعد عورت کا رابطہ اپنے خاندان سے ختم ہوجاتا ہے۔ شاستر قانون کی رو سے وہ اپنے خاندان سے میراث کی حقدار نہیں رہتی۔ اسی لئے جب لڑکی کو گھر سے رخصت کیا جاتا تھا تو اسے کچھ دان دیکر رخصت کیا جاتا تھا۔ (۷(

ہندوستان میں مسلمان اور ہندو چوں کہ اکٹھے رہتے تھے اس لیے رسوم و رواج میں بہت سے رواج اور روسومات مسلمانوں نے ہندوؤں سے مستعار لیں جن میں سے ایک جہیز بھی ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرسودہ رسومات اس حد تک راسخ ہو گئی کہ لوگ اسے ضروری سمجھنے لگے اورسماج میں عزت کو برقرار رکھنے کی وجہ سے اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینے لگے۔مالی حیثیت سے اعلیٰ طبقات تو یہ رسم ادا کر لیا کرتے تھے لیکن معاشرے کے دیگر طبقات میں یہ رسم کسی مصیبت سے کم نہ ہے اکثر گھروں کی لڑکیاں اسی وجہ سے تمام عمر باپ کے گھر پرگزار دینے پر مجبور ہیں۔اور جو لوگ وقتی زیبائش اور معاشرے میں اپنا بھرم قائم رکھنے سکی خاطر بھاری جہیز دے بیٹھتے ہیں ان کی عمر قرض چکانے میں صرف ہو جاتی ہے۔نذرسجاد حیدر نے بھی اپنے ناول میں اس رسم کے نقصانات کو مد نظر رکھا اور ہندوستانی رسوم و رواج کی عکاسی کی ہے۔ نذر سجاد نے معاشرے کے مسائل کو ختم کرنے کے لیے اس رسم کے تمام تر مضر اثرات کو مد نظر رکھا اور پڑھے لکھے کردار کے ذریعے جہیز کے بارے میں کچھ یوں خیالات پیش کیے ہیں:

"مسز ضیا الحسن:غیر شرعی رسومات پر عمل نہ کرنے سے گناہ سے بھی بچے...

لڑکی کے جہیز میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے... وہی سامان دینا چاہیے جو ان کے کام آسکے"(۸(

اسی طرح شرعی طور پر شادی کی حمایت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

مسز وقار:---اور سامان ہی ایسا کیا کرنا ہے۔کون سے بٹوے۔تلیدانیاں۔بوغبوند سلیں گے۔

---میرٹھ کی بیگمات سیاگر میں نے مشورہ کیا تو وہ دو سو جوڑا اور ایک بٹوا تیار کرنے کا حکم دے دیں گی...ہم تو یہ شادی نئے طریقے پر بالکل سیدھی سادی شرعی طور سے کرنا چاہتے ہیں۔"(۹(

۶۔ بچے کی پیدائش پر کی جانے والی رسوم

ہندوستانی معاشرے کی رسوم و رواج کی عکاسی کرتے ہوئے بچے کی پیدائش پر کی جانے والی لغو رسومات کو بھی پیش کیا گیا ہے جن کی تفصیل ذیل کی سطور میں ہے۔

۱۔۶۔ چھٹی کی رسمیں

بچے کی پیدائش کے چھٹے روز ہندوستانی بیبیاں پورے خاندان کو اکٹھا کر کے جو رسوم ادا کیا کرتی ہیں انھیں چھٹی کی رسمینکہا جاتا ہے جس میں سے درج ذیل کو ناول میں پیش کیا گیا ہے:

۱۔ پلنگ سے اتار کر فرش پر بٹھانا---اس دوران میں گود میں بچی کا ہونا کیوں کہ اگر بچی پہلی دفعہ زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے بچی گود میں نہ ہوئی تو اسے بد شگونی سمجھا جائے گا۔

۲۔ کھانا کھلانا...۔ کھانا اس طرح کھلایا گیا کہ پہلے سات سہاگنوں(جن کی گود میں بچہ ہو) نے ہاتھ ڈال کر کھانا چکھا پھر ماں کو کھلایا گیا۔

۳۔ سہرا باندھنا...ایک رسم بچے کے سر پر سہرا باندھنے کی بھی کی گئی۔

۴۔ گود بھرائی...سامان میں ناریل، بادام، چھہارے، کشمش، پستہ، کھیلیں، پتاشے وغیرہم بچی سمیت ڈالنا۔

ایک طرف تو قدیم رسومات کی دلدادہ خواتین اور ان رسومات کی اہمیت کو سراہنے والی خواتین کے کے کردار پیش کیے گئے ہیں تو دوسری طرف مسز وقار کا کردار بھی پیش کیا ہے جو اپنی روشن خیالی کی وجہ سے ان تمام رسومات کے خلاف تھیں اور انھوں نے ان سے خود کو اور اپنے اہل خانہ کو بچا رکھا تھا۔ اور وہ اپنی بیٹی تک کو ان رسومکی اجازت نہیں دیتی تھی جبکہ دوسرا طبقہ چھوٹے بڑے سمیت ان رسومات کا قائل تھا اور اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔

۷۔ بیٹے کی پیدائش پر خوشی اور بیٹی کی پیدائش پر غم کا اظہار

عموماً لڑکیوں کو پرایا دھن سمجھا جاتا ہے اسی لیے بیٹی کی پیدائش پر اکثر غمزدہ ہوجا نااوربیٹے کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کرنا ہمارا ایک عام معاشرتی رویہ ہے۔ناول میں ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی کے دوران بیٹے اور بیٹی کے افتراقات کو واضح انداز میں تو پیش نہیں کی کیا گیا لیکن کرداروں کی ذہنی کشمکش سے یہ تصور ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے کہ لوگ بیٹے کی پیدائش کو ہی باعث افتخار سمجھتے ہیں، ناول میں جانی بیگم کا کردار اس کی عملی مثال ہے وہ فرسودہ خیالات کی مالک تھی اپنی دوسری بیٹی کی پیدائش سے پہلے پر امید تھی کہ بیٹا ہو اتو خاندان کا نام اونچا ہو گااور انھیں شوہر کی جائداد سے بھی حصہ ملے گا لیکن بیٹی کی پیدائش پر ان کے تمام ارمانوں پر پانی پھر گیا اور وہ اندر ہی اندر اداس بھی ہوئیں۔دوسری بیٹی کی پیدائش پر وہ بظاہر تو مسکرا رہی تھی اور نوبت بجوانے کا اہتمام بھی کیا(نوبت کا مفصل حال) لیکن اندر ہی اندر وہ سخت اذیت میں مبتلا تھی اس نے محض پڑھے لکھے خاندان میں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے نوبت بجوائی:

..."وہ وقت آیا جس کی لاکھ لاکھ ارمانوں سے بیگم صاحبہ منتظر تھیں۔لیکن افسوس خلاف امید ظہور میں آنے سے ان کا دل بالکل بجھ گیا...انھوں نے ظاہراً خوشی میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیا...لڑکی خبر باہر پہنچتے ہی نقارچیوں نے جو بیٹے کی خبر کے منتظر تھے نوبت بجانا شروع کر دی۔ گو بیٹی کے ہونے پر دستور کے بموجب یہ باجا نا مناسب تھا لیکن گھر سے بی امانی یگم مغلانی کا حکم آیا تھا"(۱۰(

ناول میں نذر سجاد نے جہاں بچے کی پیدائش پر اظہار خوشی و غم کا ذکر کیا ہے وہیں اس پیدائش پر اظہارِ خوشی میں نوبت بجوانے کی رسم کو تعلیم یافتہ طبقے میں نا پسندیدگی کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔ اس حوالے سے وکیل صاحب اور اختر کو محلے کے خوف سے شرمندہ دکھایا گیا ہے کہ محلے کے معزز لوگ اس حرکت پر کیا کہیں گے۔

۸۔ خاندان کا وارث:بیٹا

ہندوستانی معاشرے میں بیٹے کی پیدائش کو قابل فخر سمجھا جاتا ہے اور اگر کسی کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہو جائے تو معاشرے کے دیگر افراد کے ساتھ ساتھ ماں بھی اس بات پر خائف رہتی ہے کہ میں اپنے شوہر کو خاندان کا وارث نہ دے پائی۔اور بیشتر مرد تو بیٹے کی چاہت میں دوسری شادی بھی کر لیا کرتے ہیں تا کہ ان کا نام آگے چلانے والا نورِ چشم کوئی تو ہو۔حالاں کہ یہ رویہ محض فرسودہ خیالات اور غلط سماجی رویوں کی پیداوار ہے۔ خدا نے دنیا میں کسی بھی شے کو بے مقصد تخلیق نہیں کیا۔ایسے میں بیٹی کی پیدائش کو بوجھ تصور کرنا جہالت کے سوا کچھ نہیں۔نذر سجاد حیدر نے اپنے ناول میں اس مسئلے کی عکاسی کرتے ہوئے ہمارے معاشرتی رویوں کی فرسودگی پر طنز کیا ہے اور یہ نظریہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیتا ہو یا بیٹی دونوں معاشرے کے با وقار فرد ہیں اور ہم کسی کو بھی محض صنفی تقسیم پر چھوٹا بڑا یا اہم یا غیر اہم نہیں قرار دے سکتے۔

"بعض ہندوستانی لوگوں کا خیال ہیکہ کم از کم ایک بیٹا ضرور ہو نا چاہئے جو جائداد وغیرہ کا مالک ہو۔اور جس سے نام چلے۔جناب من یہ خیال محض فضول اور جاہلانہ ہے۔ اپنے بعد کی جائداد کواخواہ کوئی مالک ہو۔اس سے کیا فائدہ؟بیٹا مالک ہو گاتو باپ کو ثواب پہنچے گا اور کسی غیر کے کام آیا تو گناہ ہو گا؟۔"(۱۱(

اسی طرح خاندان کا نام چلانے کی آرزو میں بیٹے کی خواہش بھی ایک عام تصور تھا بہت سے خاندان بیٹے کی خواہش اسی لیے کرتے تھے کہ ان کے بعد ان کا نام چلانے والا کوئی تو ہو۔اس رویے پر نذر سجاد حیدر نے یوں تنقید کی ہے:

"نام چلانے کی آرزو ہی محض بے وقوفی ہے۔فرض کرو بیٹا ہوا اور وہ زندہ رہا۔پھر اس کے اولاد ہوئی۔اور اس کی اولاد کی اولاد ہوئی تو یہ سلسلہ قیامت تک چلا جائے گالیکن نام آوری کی آرزو رکھنے والے شخص کا نام کیال کیجیے کہاں تک باقی رہ سکتا ہیاور کون کون اسے جانتا ہے؟مجھے اپنے دادا مرحوم کے دادا کا نام بھی معلوم نہیں حالانکہ ان کی بھی خواہش ہو گی کہ میری نسل باقی رہیاور نام چلے۔"(۱۲(

۹۔ بیوہ کے مسائل

ہندوستان میں بیوہ کا کسی قسم کی آرائش و زیبائش کرنا غلط تصور کیا جاتا تھا بل کہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ شوہر کی وفات کے بعدعورت کا کھل کر جینا، ہنسنا کھیلنا، کسی بھی میدان میں آگے بڑھنا، پڑھنا لکھنا سب برا سمجھا جاتا تھا اور اس سے اس خوشگوار زندگی گزارنے کا حق چھین لیا جاتا تھا۔ لیکن اس ناول میں نذرسجاد حیدر نے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہ عورت بھی اس کے غم میں دنیا کے رحم کرم پر خود کو چھوڑتے ہوئے مرقع غم و الم بن جائے اور دنیا کے رحم و کرم پر جینا شروع کر دے بل کہ اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو مضبوط بنائے اور معاشرے کی بجائے اپنے زور بازو پر بھروسا کرتے ہوئے زندگی کا سفر دوبارہ شروع کرے اور پر اعتماد شخصیت کے طور پر سر اٹھا کر جیے۔اس دور کے معاشرے کی عکاسی درج ذیل سطور سے ہوتی ہے:

"ابا جان زمانہ بہت برا ہے اور خصوصاً ان اطراف پر تو جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔کان پور اور میرٹھ کے بہت سے مخالفینِ تعلیم نسواں میری بابت آپ کو بہت کچھ برا بھلا کہیں گے۔اور بیگم صاحبہ تو غضب ہی ڈھائیں گی۔جس کا مجھے از حد خیال ہے۔مگر میں مجبور ہونکہ سوائے قومی خدمت کے میری بسر اوقات کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔اس لیے عرض خدمت ہے کہ جو کوئی بھی آپ سے کچھ کہے آپ یہی کہ دیں کہ میری اجازت سے میری بیوہ لڑکی زنانہ سکولوں کی نگرانی کی خدمت انجام دے رہی ہے۔(۱۳(

غلط سماجی رویوں کی بنا پر جب اختر کو معاشرے میں رسوا کر دیا گیا تو اس وقت چچا کے گھر سے نکلتے ہوئے اس نے یہ عہد کیا کہ اب کسی کے رحم و کرم پر نہیں رہے گی بل کہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کے لیے سر گرم عمل ہوگئی اور ہندوستان کی پہلی بی اے خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ شعبہ تعلیم میں انسپیکٹر بھی بھرتی ہو گئی اور اپنی زندگی کو خود مختاری سے بسر کیا۔ اس کی مثال ڈیل کی سطور میں ہے:

"ابا جان اس حالت میں میں نے اتنا کچھ صرف اس خیال سے کیا کہ جب خدا نے مجھے پیدا کیا ہے تو دنیا میں بے کار ثابت نہ ہوں۔اپنی ہستی کو کار آمد بنانے کے لیے اس قدر دقتیں اٹھائیں۔ورنہ میرے دل میں حوصلہ اور مجھ میں ذرا ہمت نہ تھی۔خدا کا لاکھ شکر ہے کہ آج میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئی۔"(۱۴(

ایک طرف اختر النسا نے اتنی ہمت دکھائی کہ ایسے معاشرے میں جہاں خواتین کا گھر سے نکلنا اور تعلیم حاصل کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا، اس نے بیوگی میں نا صرف اعلیٰ تعلیم کا حصول ممکن بنایا اور اس کے بعد نوکری بھی کی، بل کہ اس نظریے کی تردید بھی کی کہ عورت مرد کے بغیرادھوری ہے۔ایسے حالات میں اس نے تن تنہا جب خاندان کا کوئی دوسرا فرد اس کا معاون نہیں تھا اس نیاپنا سفر جاری رکھا لیکن ہندوستانی معاشرے میں رہ کر یہ سفر اتنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت کے ہندوستانی معاشرے میں بیوہ عورت کا وجود ہی نا قابل قبول تھا۔ اس لیے اختر نے اپنا نام تبدیل کر کے ستارا بائی رکھ لیا اور اپنا مذہب پارسی ظاہر کیا۔تبدیلی کا یہ عمل معاشرتی جبر کی واضح تصویر پیش کرتا ہے۔ عورت کو ان مجبوریوں سے بچنے کے لیے فرار کا راستہ اپنانا پڑتا ہے جو بعض اوقات اس

کی مذہبی اقدار کو بھی مسخ کر کے رکھ دیتا ہے۔لیکن اس معاشرے میں مسلمان بیوہ کا گھر سے نکل کر سر گرم عمل ہونا اس قدر آسان نہیں اسی لیے اختر نے درمیان کا راستہ چنتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔

۱۰۔ دوسری شادی کی مخالفت

ہندوستانی معاشرے میں مرد کی دوسری شادی کا رواج اور رجحان دونوں بہت نمایاں تھے، پہلی بیوی کی وفات کے بعد تو شادی کرنا تو معمول تھا ہی لیکن کچھ افراد بیوی کے ہوتے ہوئے بھی تعدد ازدواج کا اشتیاق رکھتے تھے "اخترالنسا بیگم"میں ایک سوتیلی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ایسی لڑکی جس کی والدہ کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا اور والد کی دوسری شادی کے بعد سوتیلی ماں کے مظالم سے زندگی دو بھر ہو گئی تھی۔ سوتیلی ماں کا رویہ بظاہر تو محبت بھرا تھا لیکن اندر کی حسد اور بغض کی وجہ سے وہ اسے نقصان پہنچانے سے نہ رہ سکی، ایک تو سوتیلی ماں اور دوسرا اس کی پہلے بھی ایک بیٹی تھی تو وہ اس لاڈلی بیگم کو ہمیشہ اختر سے بڑھ کر چاہتی اور اختر کے لیے ہمیشہ زندگی کے راستے پر چلنا مشکل کر دیا کرتی تھی۔ ناول میں نذر سجاد حیدر نے دوسری شادی کی مخالفت کرتے ہوئے اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل اور نقصانات بیان کیے ہیں۔جس کی ایک مثال ذیل کی سطور میں ملتی ہے:

"اختر:افسوس مجھے اتنا بھی معلوم نہیں۔کہ میں آج جن لوگوں کے سپرد کی گئی ہوں۔وہ لوگ کون ہیں۔کہاں کے ہیں؟کیسے ہیں؟جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہو گی۔اس کی عادات۔مزاج، اخلاق۔تعلیم۔عمر۔خیالات۔نام تک بھی تو مجھے نہیں معلوم۔مجھے بیگم پر کچھ افسوس نہیں۔وہ سوتیلی ماں ہے میرے ساتھ جو بھی کرے بجا ہے۔ہائے افسوس تو پیارے ابا جان پر ہے انھوں نے مجھ پر ذرا رحم نہ کیا اور غیروں کی خوشی پر مجھے قربان کردیا"(۱۵(

ناول میں اقبال بہادر کا کردار بھی دوسری شادی کی مخالفت کرتا نظر آتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رجحان ان پڑھ لوگوں میں زیادہ تھا اور پڑھے لکھے افراد اسے مسئلہ ہی سمجھتے تھے۔اقبال بہادر نے وکیل صاحب کے تمام تر مسائل کی وجہ دوسری شادی کو قرار دیا ان کے مطابق وکیل کی ایک غلطی دوسری شادی تھی اور دوسری بڑی غلطی بنا تحقیق کے شادی تھی۔وکیل صاحب نے محض اپنی بیٹی کے خیال سے دوسری شادی کر لی مگر وہ یہ بھول گئے کہ حقیقی ماں اور سوتیلی ماں میں بہت فرق ہوتا ہے انھوں نے دوسری بیوی کے رنگ میں ڈھلتے ہوئے اپنی بیٹی کو خود اپنے ہاتھ سے گنوا دیا اور پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی اور ان پڑھ بیوی کیکہنے پر اس کے مزاج سے مختلف لوگوں کے ہاں بیاہ دیا جو محض روپے پیسے کے لالچ میں اسے بیاہ کر لے گئے۔

ستارا جو کہ "اختر النسا " ہی ہے اس نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کی بڑی وجہ اپنے والد کی دوسری شادی کو قرار دیا ہے کیوں کہ سوتیلی ماں کے آجانے سے اس کا اپنا گھر اپنا نہ رہا تھا اور وہ اس میں قیدیوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ایک موقع پر جب اسے دوسری شادی پر اظہار خیال کا موقع ملا تو اس نے دوسری شادی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

"ستارا: معاف کریں۔آپ لوگوں میں دوسری شادی کا بہت برا رواج ہے۔اسی کے سب برے نتائج ہیں۔

مسز وقار: بے شک یہی وجہ ہے ہم خود اس کے قائل ہیں۔۔۔"(۱۶(

۱۰۔ پردے کی بحث

ہندوستانی معاشرے میں خواتین کے پردے کو ایک خاص کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور ہر گھر میں اس کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھایہاں محض جسم کا پردہ کا نہیں تھا بل کہ لڑکی یا عورت کی آوازکا بھی گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔یہاں تک کہ خواتین کے نام تک کا پردہ رکھنے کے لیے لڑکیوں کے نام عموماً مردوں کے ناموں کی طرح کے رکھے جاتے تھے تا کہ اگر کسی کا نام باہر لیا جائے تو لڑکی یا لڑکے کی تخصیص نہ ہو سکے۔ معاشرہ چوں کہ مصنف کے ذہن اور تخلیقات پر اثر انداز ہوتا ہے اسی لیے نذر سجاد حیدر بھی اس کے اثر سے اپنا قلم بچا نہ سکی اور انھوں نے پردے کی مختلف صورتیں اور نوعیتیں اپنے ناول میں پیش کی ہیں۔

سب سے پہلے ناموں کے حوالے سے دیکھا جائے تو اخترالنسا بیگممیں بھی لڑکیوں کے ایسے نام استعمال کیے گئے ہیں جو مذکر کے لیے مستعمل ہیں جیسے ناول کا مرکزی کردار اختر خود اور اس کی خالہ زاد بہنیں، نجم اور قمر ان سب کے نام گرامر کے اعتبار سے مذکر ہیں لیکن یہاں "النسا "کا اضافہ کر کے انہیں لڑکیوں سے منسوب کر دیا گیا ہے۔اسی طرح ناول میں مسز، بیگم اور اس طرح کے القابات کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ جیسے مسز وقار، مسز خورشید، مسز تجمل وغیرہم کا استعمال کیا گیا ہے، جس کا مقصود بھی شاید نام نہ لینے کی پابندی تھی۔

ناول میں ہندوستان کے جس معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے وہاں پردے کی اس حد تک پابندی تھی کہ ہر طبقے کی عورت پردے کا اہتمام کیا کرتی تھی۔پڑھی لکھی خواتین جو گھروں سے باہر جایا کرتی تھیں وہ بھی اس بات کا خاص خیال رکھتی تھیں کہ کسی غیر محرم سے کوئی گفتگو نہ ہو پائے۔اگر گفتگو کرنا ضروری بھی ہوتا تو پردے کی اوٹ میں بات چیت کی جاتی تھی۔اس کی مثال ذیل کی سطور میں ہے:

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔کہ اچھا ہم منظور کریں گے۔کیا وہ لیڈی خود ہم سے اس بارے میں گفتگو نہیں کر سکتیں؟

ماسٹر صاحب نے کہا کر سکتی ہے۔اور اختر کو اطلاع دی۔

کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ادھر ڈاکٹر کھڑے تھے۔اور ادھر اختر انگریزی میں دونوں کے بخوبی سوال و جواب ہوئے۔۔۔"(۱۷(

اس دور کے ہندوستانی معاشرے کو دیکھا جائے تو ایک اور قابل غور پہلو یہ ہے کہ اگر مسائل حد سے تجاوز کر جائیں اور معاملات بگڑنے لگیں تو ایسے میں پردے کو راہ کی رکاوٹ بنا کر بیٹھے رہنا کوئی معقول بات نہیں ہے۔نذر سجاد حیدر نے یہاں یہ تصور پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب حالات سازگار نہ ہوں تو ایسے میں پردے میں بیٹھ کر خود کو محتاج تصور کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی صورت میں انسان کو چاہیے کہ وہ خود کو حالت کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے

مسائل کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کریتا کہ عزت نفس پر آنچ نہ آنے پائے۔اس کی ناول میں یوں ملتی ہے:

"اب وہ سخت مجبور تھی، کوئی اس کا مددگار نہ تھا۔اس لیے ایسے آڑے وقت میں وہ ہندوستانی پردہ قائم نہ رکھ سکتی تھی۔"(۱۸)

یہاں پردے کی پابندی کی وجہ سے گھر پڑے رہنا اور بیوہ کی ہندوستانی رسوم کی پابندی کرنا دونوں مراد ہیں۔ناول میں نذر سجاد حیدر نے ہندوستانی معاشرے میں پردے کی پابندی کی بحث تفصیل سے کی ہے۔ مختلف کردار اس کی عملی مثال کے طور پر بھی پیش کیے ہیں لیکن اختر کا بیوہ ہونے کے بعد نوکری اور تعلیم کے لیے سر گرم عمل ہونا۔اس وقت کی ہندوستانی رسومات سے بغاوت کرتے ہوئے گھر سے نکلنا خواتین کے لیے ایک مثبت محرک کے طور پر برتا گیا ہے۔کیوں کہ محض سوگوار ہو کر زندگی کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا مسائل کا حل نہیں ہوتا۔یہاں نذر سجاد حیدر نیان معاشرتی عوامل سے بھی پردہ اٹھایا ہے جن کی وجہ سے اختر کو اپنی شناخت بدل کر بیوہ سے پارسی لیڈی بننا پڑا۔یہ ہندوستانی معاشرے کے دوہرے معیارات ہیں جو ایک طرف بیوہ عورت کے لیے زندگی کے تمام دروازے بند کر دیتے ہیں۔اور دوسری طرف اسے پردے اور جبری پابندیوں سے بھی متثنیٰ قرار نہیں دیتے۔ایسے نا موافق حالات میں اختر النسا کا اپنا نام، رہن سہن، شناخت اور معمولات زندگی کو تبدیل کر لینا نہایت جرات مندانہ قدم ہے۔

درج بالا تمام تحقیق کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہاخترالنسابیگمکو خاص مقاصد کے تحت تصنیف کیا گیا ہے۔ناول سماجی مسائل کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں سر فہرست بچپن کی شادی اور منگنی ہیں، نذر سجاد کے مطابق بچپن کی منگنی انسانی شخصیت پر ناگوار اثرات کی ایک وجہ بن جاتی ہے۔اس کی بڑی وجہ میاں بیوی کی ذہنی ہم آہنگی نہ ہونا ہے یعنی یہاں یہ نظریہ پروان چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شادی میں لڑکے اور لڑکی کی پسندیدگی کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر ان کی ذہنی مطابقت ہو گی تو زندگی خوشگوار ہو گی ورنہ وہ دونوں آپس میں الجھتے ہوئے زندگی گزار دیں گے اسی مسئلے کوشادی کے معاملے میں لڑکے اور لڑکی کی پسند کے مضمون میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

نذر سجاد نے ہندوستانی معاشرے میں خوشی اور غم کے موقع پر اداکی جانے والی بے جا رسومات پر تنقید کی ہے اور انھیں فضول قرار دیا ہے۔ اس میں انھوں نے خاص طور پر جہیز جیسی معاشرتی برائی کوموضوع بنایاہے۔غم کے موقع پر بیوہ کی زندگی کے حالات و واقعات کو زیر بحث لایا گیا ہے او ریہ نظریہ ترتیب دیا گیا ہے کہ بیوہ عورت کو اپنی مرضی سیزندگی گزارنے کا مکمل حق حاصل ہے معاشرہ اس سے یہ حق نہیں چھین سکتا۔یہاں پدر سری معاشرے کے اس نظام کی خلاف ورزی کی گئی ہے جو صدیوں سے چلا آرہا تھا اور کردار کے ذریعے اس کی عملی مثال بھی پیش کی گئی ہے۔ناول میں بیٹے اور بیٹی کے درمیان روا رکھی جانے والیفرسودہ نظام کو بھی ہدف تنقید بنایا گیا ہے اور اسیجہالت اور ان پڑھ لوگوں کی خام خیالی کے علاوہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہاں بیوہ کا نوکری کرنا پدر سری معاشرے کے ان بندھنوں کو توڑنا تھا جو صدیوں سے بندھے چلے آرہے تھے لیکن یہاں بھی

نذر سجاد مکمل طور پر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو پائی۔اور ان کے ناول کیکردار اخترالنسا بیگم بھی بیوگی میں سادہ لباس پہننے کو ترجیح دیتی ہے۔اس کے علاوہ تعلیم کے حصول کے لیے مسلمان لڑکی کا خود کو پارسی ظاہرکرنا اور اپنا نام اور لباس تبدیل کرنا بھی دو ایسے عمل تھے جو بظاہر تو اس دور کے معاشرتی رجحانات کے خلاف جا رہے تھے۔لیکن اب بھی کہیں کہیں اس کے حصار میں تھے۔

ناول میں ایک اور موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ برائی کا دورانیہ طویل نہیں ہوتا۔اختر پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والی سوتیلی ماں اور بہن اسے اس کے اپنے گھر سے بے دخل کرنے اور باپ کو بیٹی سے مصلحتاً دور کرنی والی خواتین یہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ شاید یہ عیش و عشرت ہمیشہ ان کا مقدر رہے گا اور وہ کبھی اپنے بچھائے ہوئے جال میں نہ پھنسیں گی، جبکہ حقیقت اس کے بر عکس ہے۔ خدا نے نیک اعمال کا بدلہ نیکی اور بد اعمالی کا بدلہ بدی میں رکھا ہے جسے مکافاتِ عمل بھی کہا جاتا ہے، تو ہوا بھی یوں کہ خلق خدا پر نا حق ستم ڈھانے والے دشمنان کی خوشی کی عمر لمبی نہ ہوئی اور وکیل(والد اختر) کو جلد ہی اپنی دوسری بیوی کی حرکات و سکنات کا علم ہو گیا کہ کس طرح طمع میں مبتلا ہو کر وہ ان کے گھر کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی اور بیٹی اور باپ میں دوریاں پیدا کر رہی تھی۔آخر کار وہ اپنے بنے ہوئے جال میں خود پھنسی اور گھر چھوڑ کر بھاگ نکلی۔یعنی اسیاپنے بسے بسائے گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔دوسری طرف بیگم نے اپنی لاڈلی بیٹی کی شادی بڑے شوق سے اپنی سہیلی کے بیٹے سے رچائی تو وہ بھی اپنی بد اخلاقی کی وجہ سے زیادہ دن خوشی کے بسر نہ کر سکی اور بے سکون ہو گئی۔

یہاں ایک اور حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ جس انسان میں احساس اور ہمدردی کا فقدان ہو وہ کبھی دوسروں کی بھلائی اور مفادنہیں سوچ سکتا۔اختر النسا بیگم کی سوتیلی ماں اپنے تمام تر حالات و واقعات سے پردہ اٹھ جانے کے باوجود بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتی بچا کچا سامان لے کر فرار ہو گئی کیوں کہ جو انسان مادیت پرست ہو جائے اسے کسی سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔پردے کے حوالے سے بات کی جائے تو یہاں بھی مصنفہ نیمعاشرتی اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے لیکن ابھی بھی قدیم روایات کی گرفت مضبوط ہے یہی وجہ ہے کہ کردار کہیں تو آزاد گھوم رہے ہیں اور کہیں پردے کی اوٹ میں اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔

حوالہ جات:

)۱(نذر سجاد حیدر، اختر النسا بیگم، لاہور:دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۵، ص۱۰۶

)۲(ایضاً، ص۵۶

)۳(ایضاً، ص۱۰۴

)۴(ایضاً، ص۷۰

)۵(ایضاً، ص۷۱، ۷۲

)۶(ایضاً، ص۷۲

(7) http://org.wikipedia.ur/wiki/April29,2017,Saturday,3:00pm

)۸ (نذر سجاد حیدر، اخترالنسا بیگم، ص۸۴، ۸۵

)۹(ایضاً، ص۶۷

)۱۰(ایضاً، ص۳۰، ۳۱

)۱۱(ایضاً، ص۱۸۴

)۱۲(ایضاً، ص۱۸۴

)۱۳(ایضاً، ص۱۷۹

)۱۴(ایضاً، ص۲۳۲

)۱۵(ایضاً، ص۱۰۴

)۱۶(ایضاً، ص۲۲۰

)۱۷(ایضاً، ص۱۶۴

)۱۸(ایضاً، ص۱۷۶

/...../